کونسل کی سرگرمیاں

نئی دہلی میونسپل کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو نے بتاریخ ۱۵ر دسمبر ۲۰۱۳ء کو ''جشنِ سی پی آر 10'' کا افتتاح تال کٹورا انڈور اسٹیڈیم میں کیا۔ یہ پروگرام این ڈی ایم سی اور ہارٹ کیئر فاؤنڈیشن کی جانب سے منعقد کیا گیا۔ ڈاکٹر کے۔کے۔ اگروال اور ڈی پی کے شرما نے اِس تکنیک کے بارے میں یہ جانکاری دی کہ اگر ہارٹ اَٹیک کے دس منٹ کے اندر ''پی سی آر 10'' کا استعمال کیا جائے تو مریض کو بچایا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں موجود اسکول کے طلبا، ممتاز افسران اور کارکنان کو اِس تکنیک کو استعمال کرنے کی تربیت دی گئی۔

کونسل کی سرگرمیاں

۱۴؍نومبر ۲۰۱۳ء کو انڈیا گیٹ کے چلڈرن پارک میں کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو نے لائبریری کا افتتاح کیا۔ اس افتتاحی تقریب کے موقع پر شعبۂ تعلیم کی ڈائریکٹر محترمہ وِدوشی چترویدی اور نظم سناتے ہوئے اُردو، پنجابی آفیسر محترمہ انیس فاطمہ وممتاز افسران کے علاوہ این ڈی ایم سی اسکول کے طلباء اور اساتذہ کرام بھی موجود تھے۔

۱۹؍نومبر ۲۰۱۳ء کو انڈیا گیٹ واقع چلڈرن پارک میں شعبۂ تعلیم کی طرف سے جشنِ یومِ اردو کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر شعبۂ تعلیم کی ڈائریکٹر محترمہ وِدوشی چترویدی، اردو اور پنجابی زبان کی افسر محترمہ انیس فاطمہ کے علاوہ کونسل اسکول کے طلباء اور اساتذہ حضرات بھی موجود تھے۔ یومِ اردو کی اس تقریب میں طلبا کی جانب سے مشہور شاعر ومفکر ڈاکٹر محمد اقبالؔ کی اردو شاعری (نظم اور غزل) کو سامعین کے سامنے پیش کیا گیا۔

نئی دہلی میونسپل کونسل میں ۲۸؍اکتوبر سے ۲؍نومبر ۲۰۱۳ء تک چوکسی (Vigilance) ''بیداری ہفتہ'' منایا گیا۔ اس چوکسی بیداری ''ہفتہ'' کی شروعات ۲۸؍اکتوبر کو کونسل کے صدر جلج شریواستو کی جانب سے کارکنان وافسران کو بدعنوانی کے خلاف لڑنے اور کونسل کی خدمات میں شفافیت لانے کا حلف دِلا کر کیا۔ اس ہفتہ کے دوران کونسل کے اسکولوں میں مضمون نگاری اور بحث ومباحثہ کے مقابلہ جاتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔

ماتم کی خوشی

محمد طارق

اچانک ماں کا انتقال ہوگیا....................دِن بھر اچھی بھلی چنگی تھیں۔ رات میں سوئی کی سوئی رہ گئیں۔ ’’کون سی بیماری ماں کے اندر پل رہی تھی؟ کون ساغم تھا جو انہیں دیمک بن کر چاٹ گیا تھا؟ ایسی کون سی تکلیف تھی انھیں، مجھے خبر تک نہ ہونے دی ماں نے! اگر ذرا بھی کہتیں تو میں انھیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دِکھا کر اُن کا علاج کروالیتا، خموش مر گئیں میری ماں---، ایک لفظ بھی نہیں کہا مجھ سے!‘‘

وہ ماں کی لاش کے سرہانے کھڑا اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا............ بیوی ساس کی لاش کے پائنتی کھڑی شوہر کے جذبات کو اپنی سمجھ کے ترازو میں تول رہی تھی۔ جب شوہر اپنے جذبات کا اظہار کر چکا تو بیوی نپے تُلے لفظوں میں کہنے لگی ’’کل ممی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔‘‘

’’پھر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟!‘‘ وہ ماں کی لاش کے سرہانے کھڑا غصّے سے بپھرا۔

’’کیسے بتاتی---! بیوی نے ساس کی لاش کے پائنتی سے اپنے تیور دکھائے ’’جب انھوں نے مجھ سے کہا تھا تب ہی مجھے آفس سے باس کا فون آ گیا تھا ’’فوراً چلی آؤ---، میٹنگ ہے‘‘ باس کا فون آتے ہی میں نے فوراً آفس جانے کی تیاری کی اور نکل پڑی---ٹھیک سے میک اَپ تک نہیں کیا سمجھے! اور تم مجھ سے پہلے ہی اپنی ڈیوٹی چلے گئے تھے نا!‘‘

’’مگر آفس سے آنے کے بعد بھی تو تم مجھے بتا سکتی تھیں نا.........!‘‘ شوہر کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

’’آفس کے کام کی پریشانی میں مجھے یاد نہیں رہا...... خیر، اگر میں بتا بھی دیتی تو کیا تم انھیں فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جاتے............؟ کبھی تو ماں سے تم نے سیدھے مُنہ بات نہیں کی، آفس سے آتے، کھانا کھاتے اور ریموٹ لے کر ’’ٹی۔ وی۔‘‘ کے سامنے بیٹھ جاتے، ایک بار ماں تمہارے سامنے آئی تھیں تب تم نے انہیں بُری طرح جھڑک دیا تھا ’’آفس سے تھکا ہارا آتا ہوں اور تم اپنا رونا لے کر بیٹھ جاتی ہو، مجھے ’گھر گھر کی کہانی‘ دیکھنے دو---، یاد ہے نا تمہیں........! تب سے ماں تم سے بات کرنے سے ڈرتی تھیں۔‘‘ بیوی نے غصے میں آ کر اُس کا کچا چٹھا کھول دیا۔

بیوی کا غصہ دیکھ کر شوہر اپنی ماں کی لاش کے سرہانے سہم کر منمنانے لگا ’’ڈارلنگ! تمہاری ساری بات بجا، لیکن ماں میری مَری ہے، دُکھ تو ہوگا نا...........، خیر!‘‘ وہ اپنے سینے میں سانس کھینچ کر بولا ’’ماں کو مرنا تھا، مر گئیں، مگر ماں کی اچانک موت سے اپنی پریشانی بڑھ گئی نا.......، ہم سروِس والے، اب گھر کی دیکھ بھال اور گھر کا کام کاج کرنے والی بھروسہ مند عورت اتنی جلدی کہاں ملنے والی؟!‘‘ شوہر نے ماں کی لاش کے سرہانے سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

’’بس......، تم پریشانی کا ہی اظہار کرتے ہو، کرتے کراتے کچھ نہیں!‘‘ بیوی ساس کی لاش کے پائنتی سے ہاتھ نچا کر بولی ’’میں نے بھروسہ مند عورت کا انتظام کر لیا ہے، جب میں صبح ممی کو چائے بنانے اور گھر کی جھاڑ جھوڑ کرنے کے لیے اُٹھانے گئی تو دیکھا کہ ممی مر گئیں---فوراً انھیں فون کر دیا۔ وہ بس ابھی آتی ہی ہونگی۔‘‘ بیوی بات میں سسپنس برقرار رکھتے ہوئے بولی۔

’’کون ہے بھئی وہ عورت!‘‘ شوہر نے متحیرانہ انداز میں دریافت کیا، ’’میری ممی!‘‘ بیوی نے فاتحانہ انداز میں سر تان کر کہا۔ ’’واہ---!‘‘ شوہر کی باچھیں کھِل گئیں۔

اور پھر دونوں نے ماں کی لاش کو خوشی خوشی چادر سے ڈھانپ دیا............. ❍■❍

’’انعامدار ہاؤس‘‘ کھولا پور ضلع امراوتی ۴۴۴۸۰۲

بیٹی (نظم)

ڈاکٹر یوسف صابر

بیٹی روپ کی رانی تو
گڑیا ہے جاپانی تو
میری آنکھوں کی ٹھنڈک
شبنم کا ہے پانی تو
بیٹی رب کی رحمت تو
میرے گھر کی برکت تو
بیٹی تو ہے جان مری
روپ میرا پہچان مری
بیٹی تیرا کیا کہنا
تو ہے چاہت کا گہنا
بیٹی تو جب ہنستی ہے
میرا دل کِھل جاتا ہے
بیٹی تیری خوشبو سے
میرا سارا گھر مہکے
تو چہکے تو میں چہکوں
تو روئے تو میں روؤں
تو بولے تو میں بولوں
تو جاگے تو میں جاگوں
تو سولے تو میں سولوں
بیٹی تو ہے شان مری
تیرے دم سے ہے دنیا
تیرے دم سے ہے سب کچھ
بیٹی تجھ کو دولہن کے
روپ میں جب سے دیکھا ہے
اپنے گھر کے آنگن میں
چاند اُترتے دیکھا ہے
بیٹی تجھ کو ہے معلوم
کتنا میں مسرور ہوا

سوچ کے یہ اب اس گھر میں
دولہا تیرا جس گھر میں
جس لمحے تو جائے گی
سارے گھر کو روشن کر
شرما کے جھک جائے گی
ساری عمر بتائے گی
لیکن جب میں یہ سوچوں
سنگ اس کے یہ بھی سوچوں
گھر سے تیرے جانے پر
میرے گھر کا کیا ہوگا ؟
میرے دل کا کیا ہوگا ؟
سارے گھر میں اور دل میں
اندھیارا چھا جائے گا
ایسا وقت بھی آئے گا
سوچ کے یہ گھبراؤں میں
سوچ کے یہ تھرّاؤں میں
بیٹی ایسے لمحوں میں
میرے دل میں آجانا
یادوں کے تارے بن کر
میری روح کو چمکانا
اور جب یاد بھی تڑپائے
کچھ دن آکر جانے کو
میرے گھر بھی آجانا
میرے گھر بھی آجانا

○■○

ایم۔ایس۔جی۔کالج، مالیگاؤں کیمپ، ضلع ناسِک، (ایم۔ایس)
پِن کوڈ:423203....موبائل:9326772575

غزلیں

شاھد اختر

بے ذائقہ جدائی ملاقات رائیگاں
دن اپنا یوں ہی گزرا، گئی رات رائیگاں

میں عمر بھر اِسی طرح زائل ہوا یہاں
دریا میں جیسے ہوتی ہے برسات رائیگاں

دامِ سفر سے بچ بھی گئے ہیں جو خوش نصیب
اُن کو کرے گی گردشِ حالات رائیگاں

پھر بزمِ ناز میں ہوئی سچائی کی شکست
پھر زیرِ لب ہیں حرف وحکایات رائیگاں

حق دار ہم جو ہیں تو لٹاؤ نہ جانِ من
کب تک کروگے حسن کی سوغات رائیگاں

یہ جس قدر بھی بانٹیے گھٹتی نہیں کبھی
جاتی نہیں ہے قرب کی خیرات رائیگاں

سب اُس کے روبرو ہوئے اختر تمام عمر
اہلِ ہنر کے سامنے کمالات رائیگاں

☆☆☆

گیا کالج، گیا، بہار (انڈیا)
موبائل 9939970616

شکیل سہسرامی

کسی طرح سے نہ خالی مری زباں جائے
دیا ہے خون تو ہرگز نہ رائیگاں جائے

جو بے گناہ ہیں معصوم ہیں زمانے میں
یقیں تو دور نہ اُن تک کوئی گماں جائے

لگے جو آگ تو جل جائے سب کا سارا کچھ
نہ ایسا ہو کسی گھر میں بس دھواں جائے

دعا کرو کہ وطن میں رہے سکون سدا
غموں کا ابر چھٹے موسمِ فغاں جائے

کسی طرح نہ ہو ماحول اب خراب کبھی
نہ کوئی جسم ہو زخمی نہ کوئی جاں جائے

بلندیوں کی بھی حد ہو کوئی تصور میں
نہ اتنی دور نگاہوں سے آسماں جائے

شکیل میں نے یہی کہہ کے لے لیا ہے در
ترا فقیر ترے در سے اب کہاں جائے

☆☆☆

اردو شعبہ، بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ (بہار) 800015
موبائل 09835642267

"بھوک" (نظم)

سلیم خان

(کمسن لڑکیوں کی عصمت دری کے تناظر میں لکھی ہوئی ایک نثری نظم)

بھوکی ہوں،
بہت بھوکی ہوں، کچھ دے دو انکل
اِک کمسن خوبصورت بچی
مرے سامنے ہاتھ پسارے کھڑی ہوئی تھی
آواز میں اس کی ایک کسک
اور آنکھوں میں صدیوں کی لاچاری تھی
پانچ کا سِکّہ اسے تھماتے میں نے کہا،
پیاری گڑیا!
سڑک پہ اپنی بھوک نہ لاؤ
کہ،
انسانوں کے روپ میں
یہاں درندے بھی رہتے ہیں
اور وہ،
تم سے زیادہ بھوکے ہیں۔!!

☆☆☆

ٹانگر فیض پور، ضلع جل گاؤں
۴۲۵۵۰۳ (ایم۔ایس)

غزل

ڈاکٹر شباب لِلت

احساس کی رگ رگ میں سما جائیگا جنگل
کُہسار سے لوٹو گے تو یاد آئے گا جنگل
پیڑوں کی گھنی چھاؤں قدم اُٹھنے نہ دے گی
زنجیر سی اِک پاؤں میں پہنائے گا جنگل
دامن سے لِپٹ جائیگی اِک جادوئی خوشبو
ہمراہ بہت دور تلک آئے گا جنگل
لو بھیڑیے شہروں میں لگے آن کے بسنے
خود اپنے ہی اب نام سے شرمائے گا جنگل
لَوٹ آنے کو ہیں پھر وہی پتھر کے زمانے
پھر خون کی ہر بوند میں لہرائے گا جنگل
تم جس پہ کھڑے ہو وہ زمیں ہی نہ رہے گی
مِٹ جائیگی تہذیب جو کٹ جائے گا جنگل
راوَن کوئی ہر لے گیا اِنصاف کی سیتا
کیا پھر اسی تاریخ کو دُہرائے گا جنگل
ناچیں گے ہر چوک پہ آسیب ہَوس کے
شہروں میں ہر اک سمت نظر آئیگا جنگل

☆☆☆

B-186, Lane-vii, Sector-3,
New Shimla-171009

غــــزلیں

مومن خاں شوقؔ

(۱)

جب بھی ماضی کی وہ تصویر دکھا دیتا ہے
بیتی یادوں کو مرے دل میں جگا دیتا ہے

اس کے فن کو ہمیں تسلیم ہی کرنا ہوگا
ایک پتھر کو بھی جو موم بنا دیتا ہے

ایک وہ ہے کہ جو مجھ پر ہی ستم توڑے ہے
اک مرا دل ہے کہ اُس کو بھی دعا دیتا ہے

نعمتوں کا تری میں کیسے کروں شکر ادا
جو طلب سے مری کچھ اور سوا دیتا ہے

دینے والا تو حقیقت میں خدا ہے اے شوقؔ
کیا طلب کیجیے کسی سے کوئی کیا دیتا ہے

❍■❍

11-3-723, Mallepally,Hyderabad,
500001 (A. P.)

(۲)

پیار کی شمع جلاؤ تو کوئی بات بنے
میری تقدیر جگاؤ تو کوئی بات بنے

مست آنکھوں پہ جو پلکوں کی پڑی ہے چلمن
دھیرے دھیرے ہی اٹھاؤ تو کوئی بات بنے

جام و ساغر سے پلانا تو نئی بات نہیں
اپنی آنکھوں سے پلاؤ تو کوئی بات بنے

راہ نزدیک کی آنکھیں ہیں تم اِن آنکھوں سے
میرے دل میں اُتر آؤ تو کوئی بات بنے

شوقؔ محفل میں مچلتے ہوئے ارماں کی طرح
اک غزل اور سناؤ تو کوئی بات بنے

☆☆☆

11-3-723, Mallepally,Hyderabad,
500001 (A. P.)

غزلیں

اخترؔ کلیم غازیپوری

درویش نما رحم کے پیکر نہیں ملتے
ڈھونڈے سے کہیں خضر سے رہبر نہیں ملتے

ہر موڑ پہ مل جائیں گے یوسفؑ کے برادر
دل جن سے ملے ایسے برادر نہیں ملتے

جلتے ہوئے گھر ملتے ہیں کچلی ہوئی لاشیں
اب امن واماں کے کہیں منظر نہیں ملتے

نازاں ہے ہر اک شخص فقط اپنی خرد پر
لیکن کہیں لقمان و سکندر نہیں ملتے

اس دَور میں کرنی ہے ہمیں اپنی حفاظت
ہر وقت ابابیلوں کے لشکر نہیں ملتے

زہریلی فضائیں ہیں زمانے کی اس لیے
اونچی اڑان والے کبوتر نہیں ملتے

اخترؔ کوئی بھی ان کی طرف دیکھتا نہیں
رہنے کے لیے جن کو کہیں گھر نہیں ملتے

○■○

محلّہ خدائی پورہ غازی پور
موبائل:9889473644

منظور الحق ناظرؔ

رہگزاروں کا وہ انساں کیا تھا کیسا بن گیا
حق کا جب پیغام اپنایا فرشتہ بن گیا

میرے ہاتھوں میں رہا بے شکل پتھر کی طرح
آپ کی انگلی میں جب آیا نگینہ بن گیا

رات میں نے خواب میں دیکھا تھا آئے گا کوئی
میرا سپنا اس کی آمد کا وسیلہ بن گیا

آ رہے ہو کیا کسی گل پیرہن کی بزم سے
حسن کا پیکر تمہارا بھی سراپا بن گیا

لیکے جب اللہ کا پیغام میں گھر سے چلا
میری خاطر بحرِ قلزم میں بھی رستہ بن گیا

تو نے دیکھا جب ہوا میری محبت کا اثر
چاند سے بھی خوبصورت تیرا چہرہ بن گیا

میں کسی کی ذات پر ناظرؔ یقیں کیسے کروں
جس کو میں اپنا سمجھتا تھا پرایا بن گیا

○■○

محلّہ چاند پورہ، مئوناتھ بھنجن، ضلع مئو (یوپی)
پن کوڈ:275101

شبلی نے سرسید کی مدح میں بزبانِ عربی ایک قصیدہ لکھ لیا تھا جس میں سرسید کی تعریف اوران کی قومی قیادت کا ذکر نیز تعلیم کی اہمیت پرزور دیا گیا تھا۔شبلی نے سرسید کی خدمت میں یہ قصیدہ پیش کیا۔جس سے سرسید کافی متاثر ہوئے اور شبلی کی جوہرِ قابل کو پہچان لیا۔اس قصیدے کا پہلا شعر ہی تعلیم کی اہمیت اوراس کے مسائل پر ہے۔ کچھ اشعار کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں؛

۱۔ بزرگی علم کو بھی جہاں جاتی ہے،اپنے ساتھ لے جاتی ہے،حالانکہ ہماری قوم سے علم رخصت ہو چکا ہے۔

۲۔ بس جس شخص نے اصلاحِ قوم کے لیے سعی کی ،خدا اس کو قیامت کے دن صلہ سے محروم نہ کرے گا۔

۳۔ اگر تم مجھ سے سوال کرو کہ وہ کون ہے؟ تو میں کہوں گا کہ وہ ہمارا امام،سردار، بہادر(سید احمد خاں) ہے۔

۴۔ وہ..وہ ہے جو تمام ممالک میں بہ لحاظِ عظمت بڑھ گیا ہے اور وہ مرتبہ حاصل کیا جو اگلے زمانے والوں کو بھی حاصل نہ تھا۔

سرسید سے ملاقات کے بعد مولانا شبلی واپس گئے اور اپنی قابلیت کا سکّہ سید صاحب پر جما گئے۔ چنانچہ تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد کالج میں ایک پوسٹ اسسٹنٹ عربک پروفیسری کی خالی ہوئی اور یکم فروری ۱۸۸۳ء کو شبلی کی تقرری ہوگئی۔ پھر کچھ ہی مدت کے بعد وہ پروفیسر ہوگئے۔ چند ماہ شہر میں قیام کے بعد سرسید نے اپنی کوٹھی کے قریب ایک چھوٹا بنگلہ عنایت کیا بلکہ ان کا علمی شوق وذوق دیکھ کر انھیں اپنا کتب خانہ تک سونپ دیا۔شبلی نے سید احمد خاں کے کتب خانے سے بہت فائدہ اٹھایا۔ان باتوں نے شبلی کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے۔صحیح معنوں میں شبلی کا تصنیفی سفر یہیں سے شروع ہوتا ہے۔حکومت نے بھی ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں انھیں ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا۔شبلی کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی تھی مگر ان کا ذہن ترقی پسند تھا اور وہ نئے نظریات سے بہت جلد آشنا ہو گئے۔علاّمہ کے یہاں کسی قسم کا جمود نہیں ملتا۔علی گڑھ کالج مشرقی ومغربی علوم کا سنگم تھا۔شبلی نے اس علمی سنگم سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔سید صاحب کے انتقال (۱۸۸۹ء) کے بعد مولانا حیدرآباد چلے گئے۔وہاں بھی دورانِ قیام تصنیف وتعلیم کا کام کرتے رہے۔محکمۂ تعلیمات سے وابستہ رہے اور کئی اہم اور مفید کام انجام دیے۔لیکن وہ یہاں کچھ ہی سال رہ سکے کیوں کہ لکھنؤ کا مشہور ادارہ ندوۃ اس وقت مشکلات سے دوچار تھا۔اس لیے وہ لکھنؤ آکر ندوۃ کو بہتر بنانے میں مصروف ہوگئے۔اس ادارے کو بلند مقام پر پہنچانے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔پھر علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھ چلے آئے اور دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔اس طرح زندگی بھر علمی اورادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ان کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

شبلی ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو نثر کو ایک نیا لب ولہجہ اوراہم موڑ دینے میں خاص رول ادا کیا۔اس میں علمی اورادبی شان پیدا کی۔ان کے اسلوب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ باوجود سادہ، سلیس اورروا ں ہونے کے ایک خاص رنگ وآہنگ رکھتا ہے۔شبلی کی یہ خوبی ہے کہ وہ خشک موضوعات کو بھی اپنے زورِ قلم سے پُر لطف بنا دیتے ہیں۔شبلی کی مشہور زمانہ تصانیف ہیں: الفاروق ، المامون ، الغزالی ، الکلام ، سیرۃ النعمان ،سوانح مولانا روم،شعرالعجم ،موازنہ انیس ودبیر اور سیرۃ النبیؐ وغیرہ۔

شبلی کے یہاں ایک توازن ملتا ہے۔وہ سرسید کی رفاقت کے باوجود جدید علوم سے پوری طرح مرعوب نہیں ہیں۔سرسید کی صف میں علامہ شبلی ہی وہ شخص ہیں جو یورپی مصنفین کے علم سے مرعوب نہیں ہوئے۔یہی وجہ ہے کہ ان مصنفین کا جواب دینے کے لیے یورپ کا دورہ نہ کرکے اسلامی ممالک کا دورہ کیا۔یورپی مصنفین نے اسلام پر جو یلغار کی اس کا جواب بھی بخوبی دیا۔سید سلیمان ندوی نے مولانا کی شخصیت کی عظمت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے؛

> ''مولانا شبلی قدیم وجدید کے ایسے سنگم تھے جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے،وہ ہمارے قدیم مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم کے بہت سے آراء وخیالات سے واقف بھی تھے،ساتھ ہی محقق بھی تھے،مورخ بھی تھے،شاعر بھی تھے،ماہرِ تعلیم بھی تھے اور نئے زمانے کے تقاضے اور مطالبے کے مقابلے میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے۔''

علاّمہ شبلی نعمانی کی پوری زندگی ایثار اورقومی خدمت میں گزری۔انھوں نے ہمیشہ قوم کی خدمت کو دنیا کی دولت پر ترجیح دی اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے رہے۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام کا یہ قول حق بہ جانب معلوم ہوتا ہے؛''شبلی مسلمانوں کی ذہنی رہنمائی کے لیے ایک تندرست،صالح اورزمانہ شناس نسل پیدا کرنا چاہتے تھے۔''

(خورشید الاسلام،'تنقیدیں'،ص:۴۲)

شبلیؔ نعمانی

(مختصر جائزہ)

ابوہریرہ خان (ریسرچ اسکالر)

علاّمہ شبلی نعمانی کثیرالجہات شخصیت کے مالک تھے۔ اردو نثر کے عناصر خمسہ میں ان کا اہم مقام ہے۔ شبلی ہمارے قوم کے نقیب، سچے اور مخلص رہنما کی حیثیت سے ہماری قومی زندگی کے امانت دار اور معمار بھی تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو قوم کے لیے وقف کر دیا تھا۔ حالؔی نے ایک جگہ شبلی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا!

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن　　　تو شبلی سا وحیدِ عصر و یکتائے زمن دیکھیں

علاّمہ شبلی کے مورثِ اعلیٰ شیوراج سنگھ نے تقریباً چار سو سال قبل مسلم عہدِ حکومت میں اسلام قبول کیا۔ اب وہ شیوراج سنگھ کی جگہ ''سراج الدین'' کے نام سے پکارے جانے لگے کیوں کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد ان کا نام سراج الدین قرار پایا۔ وہ راجپوت تھے اور ''راوت'' کہلاتے تھے۔ مسلم دَور حکومت میں بے شمار راجپوتوں نے اسلام کو گلے لگایا اور وہ عام طور پر خان کہلائے۔ سراج الدین خان کے پوتے ''سہراب خان'' نے مذہبی معاملات اور روحانی کمالات میں اتنی ترقی کی کہ ان کے پیر و مرشد نے انھیں بیعت کی اجازت دے دی اور وہ شیخ سہراب کے نام سے مشہور ہو گئے۔ پھر کیا تھا ناموں سے پہلے شیخ لکھنے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور اِس خاندان کے ساتھ شیخ کا لفظ آئندہ کے لیے جڑ گیا۔

شبلی کے جدّ اعلیٰ شیخ کریم الدین گورکھپور میں محکمۂ بندوبست میں ملازم تھے۔ دادا منشی حسن علی عدالت کلکٹری اعظم گڑھ میں مختار تھے۔ والد بزرگوار شیخ حبیب اللہ ضلع کے نامور وکیل، ضلع میونسپلٹی کے آنریری سکریٹری، عوام میں مقبول اور اس وقت کی حکومت کی نگاہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے آبا و اجداد کی جائداد پر قناعت نہ کی بلکہ اپنی ذاتی استعداد و لیاقت سے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا جیسے نیل کی کوٹھیاں بنوائیں اور دیسی شکر کے کارخانے وغیرہ قائم کیے۔ خوش قسمتی سے انھوں نے اولاد بھی نیک اور صالح پائی۔ قانون میں وہ مہارت تو رکھتے ہی تھے نیز فارسی اور عربی میں اچھی صلاحیت کے مالک تھے۔

شیخ حبیب اللہ کی شریکِ حیات یعنی علاّمہ شبلی کی والدہ ماجدہ حاجی قربان قنبر مرحوم کی صاحبزادی تھیں جو اعظم گڑھ کے شہرت یافتہ وکیل تھے۔ شبلی کی والدہ نہایت نیک، عبادت گزار اور شریعت کی پابند تھیں۔ کہتے ہیں کہ تہجد تک ان سے ناغہ نہ ہوتا تھا۔ شیخ حبیب اللہ کی پانچ اولادیں ہوئیں۔ جن میں سے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹی کا انتقال عالمِ شباب ہی میں ہو گیا۔ شبلی بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان سے چھوٹے بھائی کا نام محمد مہدی حسن تھا اور انھوں نے بیرسٹری کی ڈگری انگلستان سے حاصل کی تھی۔ خاندان کی ڈھیر ساری امیدیں اِن سے وابستہ تھیں مگر ان کا انتقال ۱۸۹۷ء میں ہو گیا۔ محمد مہدی سے چھوٹے بھائی کا نام محمد اسحاق تھا اور وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک کامیاب وکیل تھے لیکن عالمِ جوانی ہی میں ان کا انتقال ۱۹۳۴ء میں ہو گیا۔ چوتھے اور سب سے چھوٹے بھائی محمد جنید بھی وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے اور ترقی کرتے کرتے سب جج ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۳ء میں دہلی میں ہوا۔

علاّمہ کی پیدائش ایک ہنگامہ خیز دَور میں ہوئی جب کہ پرانی بساط الٹ رہی تھی اور نئی بساط بچھ رہی تھی۔ اعظم گڑھ کے بندول قصبہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ جہاں ۱۸۵۷ء میں شبلی کی پیدائش ہوئی۔ جس دن شبلی پیدا ہوئے اسی دن اعظم گڑھ کے سینٹرل جیل کے پھاٹک کو توڑ کر ہندوستانی باغیوں نے قیدیوں کو آزاد کرا دیا تھا۔ ایک نہایت خوش حال، بااخلاق اور خوش مذاق باپ کے شبلی پہلوٹے تھے اور پوت کے پانو پالنے ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ خوش حال گھرانے میں ظاہر ہے کہ ان کی ناز برداری بڑے ہی سلیقے سے نبھائی گئی ہو گی۔ والد نے اعلیٰ پیمانے پر مشرقی (دینی) تعلیم کا اہتمام کیا اور بیٹے نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انیس سال کی عمر میں والد بزرگوار کی آغوشِ شفقت میں حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ حج سے پہلے انھوں نے عربی ادب میں اتنی ترقی کر لی تھی کہ عرب کے دیہاتیوں سے جب وہ فصیح و بلیغ عربی میں گفتگو کرتے تو وہ حیران و پریشان ہو جاتے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد باپ نے بیٹے کو برسرِ روزگار کرنا اور کاروبار میں لگانا چاہا مگر یہ ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ وکالت کا امتحان پاس کرایا اور یہ ایسا پیشہ تھا جو باپ کی وجہ سے بالکل بنا بنایا تھا اس میں کامیاب ہو سکتے تھے مگر مزاج کی ناموافقت کی وجہ سے دو قدم بھی نہ چل سکے۔ والد بزرگوار سر سید احمد خاں کے مداحوں میں شامل ہو چکے تھے۔ لہٰذا محمد مہدی کو ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں داخل کر دیا۔ شیخ حبیب اللہ ایک بار جب اپنے بیٹے محمد مہدی سے ملنے علی گڑھ گئے تو شبلی کو بھی ساتھ لے لیا۔

تین کہانیاں

ایس۔ شاہد حسن جیک

(۱) اور میں سو گیا: آج میں نے احساس کی چادر سر سے پاؤں تک تان لینے اور گہری نیند سو جانے کا مصمم ارادہ کر ہی لیا تھا۔ برسوں سے کچہری کا چکر کاٹتے کاٹتے عمر کے اس پڑاؤ کو پار کر لیا تھا جہاں پہنچ کر جسم کی ہڈیاں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ لگ بھگ دو ڈسمل زمین کے بٹوارے اور اس کی نیلامی کو چیلنج کر کے پہلی فتح کے جھنڈے لہرائے تھے مگر آخری فیصلہ آج تک نہیں آیا۔ عدلیہ کی سست رفتاری نے میرے دل و دماغ کو اتنا ناتواں بنا دیا کہ اب جینے کی کوئی امید باقی ہی نہیں بچی تھی۔ غش کھا کر جو بستر پر گرا اور گہری نیند سو گیا۔

(۲) دِکھاوا: مادّی ترقی کی دوڑ میں کوئی بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پتا نہیں لوگ اس دِکھاوے کی چمک دمک پر کیوں اتنا خوش ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ زمین کے اندر ہر ایک فٹ کی گہرائی میں پانی زہر آلود ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود اس کے سینے پر مشین چلائی جا رہی ہیں۔ زراعت میں بہتری کے لیے کیمکلس خوب سے خوب استعمال کیے جا رہے ہیں۔ شادی بیاہ ہو یا دیگر مذہبی رسوم ان کی ادائیگی میں ڈھول باجے، تماشے اور قمقمیں لگا کر محلوں کی شان تو بڑھائی جاتی ہے مگر اپنے سگے رشتے دار جو غربت کی مار جھیل رہے ہوتے ہیں ان کی پوچھ وہاں نہیں کیوں کہ وہ برابری کے نہیں ہیں ''کاش کوئی محبت کو روپیوں سے نہ تولے'' کچھ اسی طرح کی ٹیس میرے دل کو آج اس وقت لگی جب میرے بیٹوں نے پروفیسر صاحب کے یہاں پارٹی میں جانے کے لیے اپنے بچوں کے نئے نئے کپڑوں کی خریداری تو کر لی مگر ہفتوں سے ٹوٹا پڑا میرا چشمہ آج تک ویسا ہی ٹیبل پر پڑا نظر آتا ہے۔

(۳) بم بلاسٹ: ہر بار کی طرح آج بھی چمیلی بائی ڈھول باجے لیے اپنے چار معاون اشخاص کے ساتھ چائے کی دوکان پر بیٹھی چائے کی چُسکیاں لیتی ہوئی رحیم چاچا کو مخاطب کر کے چہرے میں طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی ''مُوا کے مُکھ میں اَگنی ڈال دو، سارے کیے کرائے پر پانی پھیر نے والے بہروپئے سیاسی داؤ پیچ میں گاؤں کی پاکیزہ ہوا زہر آلود بنانے میں نہیں چوکتے۔'' ایک معاون شخص نے چمیلی کی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا ''اِی بولی تو دل کو میرے بھی ٹھیس لگا سالہ پچھلے برس مجھے بھی ایکتا جمہوری پارٹی کا ممبر بنایا۔ الکشن کے وقت پر چار میں گلی گلی چکر لگائے۔ جیت جانے کے بعد مجھے دیکھ مُنہہ پھیر کر نکل جاتے ہیں وے سارے۔'' ایک دوسرے شخص نے اپنی بات ایکٹنگ کر کے بتانے کے لیے کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ڈھول باجے کو کنارے رکھتے ہوئے اس نے پاس میں رکھے کُدال کی طرف اشارہ کر کے زوردار آواز میں بولا؛ ''سیاست کا کھیل بڑا گندہ ہے۔ اس کھیل میں سب کے ہاتھوں میں کدال ہوتا ہے سب اپنے اپنے دشمن کے لیے گڈھا کھودنے میں مصروف رہتے ہیں۔ کس کو کب دھکّا دے کر گرانا ہے اس کا وقت مقرر نہیں ہوتا، بس وہ وقت اور حالات کے حساب سے سب گوٹی سِٹ کر لی جاتی ہے۔ وکیل، میڈیا اور پولیس کا تعاون کب لینا ہے یہ سب تعین ہو جاتا ہے جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے پچھلے دِنوں ایک مشہور مذہبی مقام پر ہونے والا بم بلاسٹ کچھ اِسی طرح کا نمونہ تھا۔'' رحیم چاچا کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اتنا ہی بول پائے؛ ''اللہ خیر کرے بے قصور کو ملزم پھر نہ کہیں بنایا جائے۔'' ○■○

پنچایتی اکھاڑا، گیا، (بہار) 9771779229

طبیعت خراب ہے، ذرا اسے بھی دیکھ جائیے'' یہ تو وہی مثل ہوئی گئے تھے نماز بخشوانے، روزے گلے پڑ گئے۔ کم بخت خضاب شباب مآب نے ہمیں ڈاکٹر بھی بنا دیا تھا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ ہمیں یہ کہنے کی بھی جا نہیں تھی کہ میاں ہم تو جانوروں کے ڈاکٹر بھی نہیں ہیں۔ مجبوراً ہم نے آنکھوں پر سے اتارا چشمہ اور انھیں ہمیں بغور دیکھ کر ہوا صدمہ۔ کھسیانی بلّی بن کر بولے! ''ارے ! آپ تو احمد خاں کے داماد ہیں'' اور ہم یہ سوچ کر آگے بڑھے کہ؛

ع ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

کچھ دنوں میں ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ خضاب زدہ جوانی جب رنگ لاتی ہے تو ایک قیامت سنگ لاتی ہے۔ ہم جدھر سے خراماں خراماں گزرتے تو کچھ پُر اسرار نگاہیں ہمارا تعاقب کرتیں اور دبی دبی ہنسی کیا آوازیں ہمارے کانوں سے ٹکراتیں۔ محلے کیا شہر بھر میں جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ ہم خضاب کی بدولت یُوٹرن لے رہے ہیں۔ ہم نے سوچا بھی نہ تھا

ع بات نکلی ہے تو پھر دور تلک جائے گی

طرفہ ستم یہ کہ ہم پر خضابی جوانی عود کر کیا آئی، بیگم کو بھی ایک آنکھ نہ بھائی۔ جب بھی ہم آئینہ کے سامنے دوبدو ہو کر بالوں کو سنوارتے تو محترمہ کے چبھتے ہوئے فقرے ہمارے کانوں کو جھنجھوڑ ڈالتے؛ ''اجی! میں نے کہا، آج کہاں جانے کی تیاری ہے؟'' ''کیا کسی اور سے بھی یاری دلداری ہے؟'' ''اجی! سنتے ہو، لگتا ہے پھر سے میرا پاؤں بھاری ہے۔'' بہت پہلے منّی بائی حجابؔ نے ایک لاجواب شعر کہا تھا؛

ع بال چوٹی کے کریں گے بدنام یہ موئے پیچھے پڑے رہتے ہیں

ہمیں مطلق بھی معلوم نہ تھا کہ بال ڈائی کے ہمیں یوں بدنام کریں گے اور خضاب ہماری ننھی سی جان کے لیے ایک عذاب بن جائے گا۔ ارے! ہم ہمارے کھیت میں روئی بوئیں کہ رائی کسی کو کیا، کہ بے مطلب اعتراض جتائے اور ہم ہماری زمین پر کاگلا بلائیں کہ بگلا کسی کو کیا کہ بے فائدہ انگلی اٹھائے۔ ظاہر ہے کہ ہم بال کالے کر رہے ہیں کوئلے کی دلالی تو نہیں کر رہے ہیں۔ اگر ہماری کھوپڑی کا اب ہر ایک بال کالا ہے تو چوری تو نہیں کی ہے، ڈاکہ تو نہیں ڈالا ہے۔ زمانہ کیا کہے گا؟ زمانے کی ایسی تیسی؛

ع ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں

اتنا کچھ ہو جانے اور اچھا بُرا سُننے سُنانے کے باوجود بھی حاشا وکلاّ ہم مطمئن ہیں اور طمانیت و فرحت محسوس کر رہے ہیں۔ پوچھیے! بھلا کیسے؟ ارے جناب کچھ دنوں بعد جب ہم بلیک کیٹ بن کر سبزی مارکیٹ گئے تو دانستہ طور پر اسی کم سِن مالی کے پاس پہنچے۔ اس نے از راہِ خواہ مخواہ ہمارے سرِ سیاہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے بولی؛ ''کیا چاہیے مسٹر! آلو، گوبھی یا ٹماٹر؟''

ہم تو اس کے تخاطب پر ہی خود کو نثار کر بیٹھے اور ہمیں اسی دن معلوم ہوا کہ؛

ع نگاہِ لطفِ مالن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

انقلاب زندہ باد کے زمانے لد گئے۔ بدلو اپنے ڈھنگ، بولو میرے سنگ؛ ''اے خضاب زندہ باد''

○■○

کالی پلٹن روڈ، پل محمد خاں، ٹونک (راجستھان)

کیوں کہ؛ ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است''

۳۔ اچھے خاصے گبرو جوان پر لڑکیاں جلدی ریجھ جاتی ہیں اور اس پر ڈورے ڈال کر اسے کلا بتو بنا دیتی ہیں۔ تمہارے سفید بال مجھے نہال کر دیں گے کیوں کہ تم کو ہر دل پھینک حسینہ آثارِ قدیمہ سمجھے گی اور تمہارے قریب بھی نہ پھٹکے گی۔ میرے لیے ہوئے تم ڈینجر لیس۔ اب نہیں مجھے کوئی پس و پیش۔ شکر خدا کہ نوبت بہ اینجا رسید

۴۔ سفید بالوں سے تمہیں دنیا جہاندیدہ اور گرگ باراں دیدہ سمجھے گی اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ چاہے گا کہ تمارے تجربات سے استفادہ کرے۔ ویسے بھی بزرگوار عقل کے عیار اور محلے کی نظر میں باکردار ہوتے ہیں۔ جب پورا محلّہ تم جیسے بزرگ کے زیرِ سایہ پروان چڑھے گا تو تمہارا نام بھی ہونٹوں سے کوٹھوں پر چڑھے گا۔

قصہ کوتاہ یہ کہ ہم نے محترمہ کو اپنا دکھڑا سنا کر گویا بھینس کے آگے بین بجائی تھی اور کیوں نہ بجاتے مقدر میں جو زن ہنسائی تھی۔ ہم نے حفیظ جالندھری کی طرح نعرۂ شباب لگایا ''ابھی تو میں جوان ہوں'' ابھی تو میں جوان ہوں'' پھر بیگم سے بولے۔ ''تم بابل کے گھر جانے والی تھیں نا! جاؤ ہم دو گھنٹے بعد وہیں آتے ہیں۔ پیری و برنائی کے موضوع پر وہیں بات ہوگی۔''

بیگم کے میکہ سدھارنے کے بعد ہم نے آئینے میں اپنا تھوبڑا ملاحظہ کیا۔ کہیں سے بھی بوڑھا دکھائی نہیں دیا۔ بھرا بھرا چہرہ، صراحی دار شاندار گردن اور کسرتی مضبوط جسم۔ ہم تو پوری طرح ہٹے کٹے کسی پہلوان کے پٹھے لگ رہے تھے پھر یاد آیا کہ شباب اور خضاب لنگوٹیا یار ہیں۔ کیوں نہ ڈائی پر ٹرائی کی جائے۔ بلیک روز کالی مہندی، سُپر واسمول، انڈیکا پرمانینٹ پوڈر ہیئر ڈائی اور گودریج کا گھولوا اور لگا لو وغیرہ بازار میں ڈائیوں کی بھرمار تھی چنانچہ بیگم کی غیر موجودگی میں سُپر واسمول نے ہماری کھوپڑی پر کیا کمال، تمام موئے سپید بن گئے قدرتی کالے بال۔ جب ہم نے دوبارہ آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو بے ساختہ و بے ضابطہ ہمارے منہ سے یہ جملہ نکل پڑا۔۔ ''ارے! وہ بڈھا کہاں گیا؟'' اور پھر سرخوشی کے خمار میں گنگنانے لگے؛

خدا نے آج تک اس شخص کی حالت نہیں بدلی ؎ نہ ہو جس کو خیال اپنی حالت کے بدلنے کا

ایک سو بیس منٹ بعد ہم سوٹیڈ بوٹیڈ ہو کر اور نک سے سک تک سج سجا کر بیگم کے پیدائشی گھر پہنچے اور بے دھڑک اندر گھُس پڑے۔۔ ''ارے! دیکھو تو یہ کون لونڈا گھر میں گھُسا آ رہا ہے؟'' ہم تو بہر حال بصد جاہ و جلال مع سیاہ بال ہم ہی تھے مگر برا ہو، سب سے پہلے خوشدامن صاحبہ نے ہمیں دیکھا اور پتہ نہیں کیا سمجھا کہ زور سے چیخ پڑیں۔ شاید ان کے ضعفِ بینائی نے یا ہماری جلوہ سامانی نے انھیں چکا چوند کر دیا۔ ان کی چلا پو کا یہ اثر ہوا کہ بیگم صاحبہ کے ساتھ ہماری سالیاں بھی اس ''لونڈے'' کو دیکھنے دوڑ پڑیں۔ بیگم صاحبہ یک ثانیہ ہمیں ٹکٹکی باندھ کر گھورتی رہیں اور پھر حیرت و استعجاب اور مسرت و انبساط سے بولیں؛ ''ارے! یہ تو منّو چُنّو کے ابّا ہیں'' دونوں سالیاں ہمیں باادب و باملاحظہ ہو کر نہارتی رہیں۔ پھر ایک چونچال سالی اسمٰعیل میرٹھی کے انداز میں بولی۔۔ ''دولہا بھائی! بتائیں تو سہی

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا کہ جنگل کا جنگل سیہ ہو گیا''

دوسری سالی اگر چہ خاموش رہی مگر ہم نے اس کی آنکھوں میں صاف استہزاء دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں؛ ''بڈھی گھوڑی لال لگام، اسلام علیکم مولانا ابوالکلام'' اور ہمیں یقین ہو گیا کہ؛ ؎ کتنی شائستہ نگاہوں کی زباں ہوتی ہے

پھر یہ ہوا کہ چہ مگوئیاں ہوئیں۔ خضاب کی خوب خوب برائیاں ہوئیں کہ ناجائز ہے، قدرت سے کھلواڑ ہے۔ خوش دامن خشمگیں ہو کر بولیں! ''شرم نہیں آتی، زمانہ کیا کہے گا''۔ واللہ! ہم تو یہ سوچ کر گئے تھے کہ یومِ شادی خانۂ آبادی کی مانند ہمیں سر آنکھوں پر بٹھایا جائے گا، ہماری کھوپڑی پلٹ کر قصیدے پڑھے جائیں گے اور کالے کالے بالوں کی آرتی اتاری جائے گی مگر ہائے وائے ؎ الٹے ہو گئے سب منصوبے ڈائی نے یوں بدنام کیا

ہم بجا طور پر کبیدہ خاطر ہو گئے تھے۔ حالانکہ نصف النہار کا ٹائم تھا مگر ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنا آفس بیگ اٹھایا، آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ چڑھایا اور ٹاٹا گڈ بائی کہہ کر باہر نکل پڑے۔ ابھی دو قدم بھی بڑھائے نہیں تھے کہ محلے کا ایک شخص بھاگم بھاگ آیا اور ہمیں روک کر بولا۔۔ ''ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب! میری بیوی کی

انشائیہ

عہدِ پیری ''خضاب'' کی باتیں

مختار ٹونکی

مشہور ہے کہ جس کو خدا رکھے اسے کون چکھے مگر چچا غالبؔ کو ڈومنی کے عشق نے اتنا چکھ، چاٹ، چوس ڈالا تھا کہ تھے تو بیچارے مگر نکمے ہو کر رہ گئے تھے اور دنیا جہان کیا، کون و مکاں میں کہتے پھرتے تھے کہ ؛ ؎ عشق نے غالبؔ نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر شراب کی لت نے شاعر اعظم کی یہ درگت بنائی تھی کہ ایک خط میں خود لکھا ہے کہ: ''بینائی کمزور، ہاتھ پاؤں میں رعشہ، حافظہ خراب اور بھوک معدوم'' سماعت کی بھی ہوگئی تھی ایسی تیسی کہ حرف مکرر کہے بغیر سنتے ہی نہ تھے۔ حالانکہ غالبؔ خستہ کی حالت نہایت خراب و خستہ ہوگئی تھی اور عناصر میں اعتدال بھی نہ رہا تھا مگر جوں توں کر کے وہ حیات کی وِکٹ پر جمے رہے اور ۳۷ رن پر کلین بولڈ ہوئے ؛ ؎ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اب ہماری سنو! عشق تو گیا بھڑ بھونجے کی بھاڑ میں، ہم تو مارے گئے زمانے کی اکھاڑ پچھاڑ میں۔ ستم ہائے لیل و نہار، گردشِ روزگار، مہنگائی کی مار اور بیٹر ہاف کی سیاہ زلف کیو کار پن بارنے ہماری جوانی دیوانی کا کچھ ایسا کچومر بنایا کہ ہم گرہستھ آشرم کے خاتمے سے پہلے ہی صفِ بزرگاں میں شامل ہوگئے۔ ہماری پیاری کھوپڑی پر چاندی اترنے لگی اور پینتالیس پچاس کو کراس بھی نہ کر پائے تھے کہ سپیدۂ سحری نطۂ سر پر نمودار ہونے لگا ؛

؎ تھا وقت سے پہلے ہی اتر آیا بڑھاپا

اور ایک دن تو وہ سر چڑھ کر بول اٹھا۔ شامتِ اعمال ما کہ ہم بیگم صاحبہ کے نادر شاہی حکم پر سبزی مارکیٹ میں ہوا خوری کو گئے۔ بھانت بھانت کی مالنیں آلو، بینگن، ٹماٹر اور بھنڈی، گوبھی، گاجر کی دوکانیں سجائے ہمیں دعوتِ نظارگی اور ترغیبِ خریداری دے رہی تھیں۔ تبھی ہماری ننھی سی کھوپڑی میں ایک شاعر کا برمحل شعر پھدک آیا ؛

؎ دخترِ مالی کی شوخی دیکھیے سرِ بازار چلاتی ہے لے سویا.... لے سویا

ہم نے بغرضِ تفریح و تفنن نسبتاً ایک نوجوان مالن کا انتخاب کیا کہ اس کا چہرہ آلو کی طرح بیضوی تھا، گال ٹماٹر کی طرح لال تھے اور پستان بینگن کی طرح قلانچیں بھر رہے تھے۔ جیسے ہی ہم نے اس کی مختلف سبزیوں پر نظر ڈالی وہ پھٹاک سے بول اٹھی --''کیا چاہیے ابا؟'' ہمارے اوپر گھڑوں کیا ٹنکیوں پانی پڑ گیا۔ ہائے ربّا! اس نے ہمیں ابا کہا۔ سفید بالوں نے گویا بھرے بازار میں ہماری بھری جوانی کو ننگا کر دیا۔ کم بخت کے معمولی سے مختصر جملے نے ایسا زبانی حملہ کیا کہ ہم ریشہ خطمی ہو کر رہ گئے۔ افتاں خیزاں اور فکر و تردد میں غلطاں ہم گھر پہنچے اور جب بیگم کو اس ناگہانی افتاد سے روشناس کیا تو وہ ٹھٹھا مار کر ہنس پڑیں اور ہنستی رہیں اور ہم ہونقوں کی طرح ان کا روئے زیبا دیکھتے رہے اور سوچتے رہے ؛ ؎ آبرو خاک ہے، کیا وقتِ ضعیفی آیا؟

جب محترمہ بیگم (بےغم) صاحبہ دل کھول کر ہنسنے سے فارغ ہوئیں تو جلے پر نمک چھڑکنے کے مصداق کہنے لگیں --''واللہ! میں واری جاؤں۔ ہائے ربّا تم منّے کے ابا تو تھے ہی اب جگت ابّا بن گئے۔ یہ تو بریکنگ نیوز ہے، گاڈ بلیس یو' یعنی وہ خوش ہو رہی تھیں کہ ہم نے بڑھاپے کے پائدان پر قدم رکھ دیا ہے۔ اما بعد انھوں نے فضائل پیری اور فوائدِ ضعیفی پر ایک تقریر چہ پیش کیا جس کے چند نکات مندرجہ ذیل ہیں ؛

۱۔ سفید بال نہیں جی کا جنجال۔ یہ بزرگی کی علامت ہوتے ہیں اور بزرگ لائقِ عزت ہوتے ہیں۔ تمھیں بھی یہ سفیدی دے گی برابر انعام۔ لوگ کریں گے جھک جھک کر سلام۔ ہر کہ پیر شود با توقیر شود

۲۔ سفیدی اور سفید پوشی انسان کے بہت سے کالے کرتوتوں کو چھپا لیتی ہے۔ جب بوڑھے لگو گے تو زمانے کی نظروں میں اچھے لگو گے اور اگر بھول چوک میں کوئی غلطی کر بھی بیٹھے اور دشنام و بہتان کے حقدار ہوئے تو دشنام دہندہ کو یہ کہہ کر شرمندہ کیا جا سکتا ہے ؛ ؎ بوڑھے کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

ساحؔر نے قصرِ شاعری کی بنیاد تخیل کی ریتیلی پُر شگاف زمین پر قائم نہ کرتے ہوئے روایت سے یکسر انحراف کیا اور تجربات وحوادث کی فولادی دیواروں سے اپنی شاعری کا شیش محل تعمیر کیا۔ انھوں نے روایتی شاعری سے ہٹ کر انسانی زندگی کے سماجی ومعاشی پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی اور انسانی مسائل کو کثرت سے اپنی شاعری میں استعمال کیا؛

ے اگلی دنیا کے فسانے چھوڑ کر، اِس جہنم زار کی باتیں کریں
تاج شاہی کے قصیدے ہو چکے، فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں

معاشرے پر ان کی گہری نظر تھی۔ دنیا کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا اُسے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا؛

ے یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا   یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے بھوکے رواجوں کی دنیا   یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

ساحؔر نے ملک وقوم کے ٹھیکیداروں کو بھی للکارا ہے اور بازارِ حُسن کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں؛

ے یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے، یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے، ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

ساحؔر کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ساحر کو عورتوں سے خاص ہمدردی تھی۔ انھوں نے اپنی کئی نظموں میں عورتوں کی زبوں حالی پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ مردوں کے مظالم کے خلاف عورتوں کی حمایت کی ہے۔ ساحر نے خواتین کو رادھا، سیتا اور مریم کا روپ دیا ہے۔ ساحر نے بتایا ہے کہ عورت کا مقام کتنا بلند ہے لیکن مرد نے اُسے اپنی ہوس کی خاطر کیسی پستی میں دھکیل دیا ہے؛

ے عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا   جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا
تُلتی ہے کہیں دیناروں میں، بکتی ہے کہیں بازاروں میں   ننگی نچوائی جاتی ہے، عیاشوں کے بازاروں میں

عورت کے اس حالت سے ساحر بہت مغموم نظر آتے ہیں اور سماج کے مردوں سے چیخ چیخ کر کہتے ہیں؛

ے مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی، یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی، پیمبر کی امّت زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں، ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ..................

اگر ساحر تخلیقی کرب کا سفر طے نہ کرتے تو ان کے نغموں میں یہ حقیقی تاثر پیدا نہ ہوتا ان کے اندر غموں اور دُکھوں کا ایک لاوا تھا جو ہر وقت کھولتا رہتا تھا اور ساحر اس میں تپتا رہتا تھا، سلگتا رہتا تھا، اور اس کے اندر کا انسان تڑپتا رہتا تھا۔ جس سے اس کا فن نکھرتا رہا۔ وہ چاند تاروں کا پرستار بن کر اُن کے نغمے نہیں گنگناتا، وہ اپنی محبوباؤں کو کوہِ قاف کی پریاں تصور کر کے ان کے حسن کے قصیدے نہیں الاپتا۔ وہ محبت اور نغمگی کا شاعر نہیں وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے پردے چاک کرتا ہے۔ معاشرے کی قلئی کھولتا ہے، پوشیدہ رازوں سے پردے اٹھاتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا طوق ہے جسے بہر حال گلے میں پہننا ہی ہے؛

ے اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ   جیسے کوئی نبھا رہا ہو رقیب سے

کُل ملا کر ساحر کی شاعری میں ایک خواب ناک اور درد انگیز فضا ملتی ہے۔ ساحر نے جہاں دلکش اور رنگین گیت لکھے ہیں وہیں ان میں جوش وولولہ، زندگی کی حرارت اور توانائی بھی موجود ہے۔ وہ وطن کی محبت سے بھی سرشار ہیں اور قوم کے غم میں بھی شریک ہیں۔ ساحر کی شاعری میں زندگی کی ہماہمی اور دعوتِ دار ورسن بھی موجود ہے۔ ساحر نے نظموں اور گیتوں کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں مگر وہ نظم گو شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ ساحؔر اپنی ''چکلے'' ''تاج محل'' ''کبھی کبھی'' ''جاگیر'' اور ''فرار'' جیسی لافانی اور پُر اثر نظموں کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ وتابندہ رہیں گے۔ ۵۹/سالہ زندگی سے رقیب کی طرح نبھانے کے بعد آخر ساحر کے حوصلے پست ہو گئے اور ''تنگ آ چکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم'' کہتے ہوئے ۲۵/اکتوبر ۱۹۸۰ء کی رات ڈیڑھ بجے ساحؔر نے دائمی اجل کو لبیک کہا اور خداوندِ حقیقی سے جا ملے۔

ساحؔر آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی زندگی کی حرارت سے بھرپور اور تابناک شاعری بہت دیر تک اور بہت دور تک ہمارا ساتھ دے گی۔

64۔ چاہ شور، امروہہ، یو۔ پی

کی کہ ان کے قلم سے ٹپکنے والا ہر ہر لفظ حقیقت کا آئینہ دار ہو۔ سچی اور کھری باتیں ساحر نے یوں بیان کی ہیں؛

مفلسیِ حسن لطافت کو مٹا دیتی ہے — بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

ساحر کا احساس زندہ اور بیدار ہے اس لیے ان کی انفرادیت کسی قسم کے بیرونی اثرات کی شرمندۂ احسان نہیں۔ اُن کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے ساحر کے یہاں بلندیٔ فکر بھی ہے اور تخیل کی گہرائی بھی۔ ان کی شاعری کا لہجہ سنجیدہ بھی ہے اور انقلابی بھی ان کی نظموں میں باغیانہ خیالات کارفرما ہیں جو کسی شاعر میں تخلیقی کرب کا طویل سفر طے کرنے کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں اور غزلوں میں بہتوں کا دِل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اختر شیرانی کی طرح ساحر نے بھی اپنی محبوباؤں کے لیے مونث کا صیغہ ہی استعمال کیا ہے یعنی محبوب کو اس کے فطری انداز میں پکارا ہے اسی لیے ان کی نظمیں بڑی فطری بڑی حسین اور دلنواز معلوم ہوتی ہیں:

میں تصوف کے مراحل کا نہیں ہوں قائل — میری تصویر پہ تم پھول چڑھاتی کیوں ہو؟

ساحر کی معصومیت اور صاف گوئی بھی قابلِ دید ہے؛

پھر نہ کیجیے مری گستاخ نگاہی کا گلہ — دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

ساحر کی آواز ایک ایسے ناکام عاشق کی آواز تھی جسے اپنے آس پاس پھیلی ہوئی ان سماجی ناانصافیوں کا بھی شدید احساس تھا جو زندگی کی بہتر امنگوں اور خوبصورت خوابوں کی قاتل تھیں۔ ساحر نے اپنی شاعری کے وسیلے سے ان بے انصافیوں کے خلاف نوجوانوں کو اُٹھ کھڑا ہونے کا پیغام دیا۔ ان کے مخاطب صرف نوجوان لڑکے ہی نہیں تھے نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ انھوں نے جوانوں کو اس طرح کا ولولہ انگیز پیغام دیا؛

جب تمھیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال — پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو؟
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو — ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اس باغیانہ پیغام میں چونکہ خود ساحر کے ناکام عشقیہ جذبات و تجربات کی کسک پوشیدہ ہے اس لیے یہ اپنے اندر غضب کی اپیل رکھتا ہے۔ ساحر نے فلموں کے لیے بھی اسی طرح کے مقصدیت سے بھرپور گیت لکھے جو زندگی اور انصاف کے لیے ایک خوشگوار پیغام بن کر فضا میں گونجے اور مدّتوں گونجتے رہیں گے۔ ساحر کی زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں اور ساحر بھی ان کی طرف بڑھے لیکن ایک خاص حد تک جا کر واپس لوٹ گئے۔ نہ جانے وہ کیا نفسیاتی الجھن تھی، کون سا جذباتی آسیب تھا جو ان کے بڑھتے قدموں کو روک دیتا تھا اور وہ؛ — چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں......

کہتے ہوئے محبوبہ کا ہاتھ چھوڑ کر پھر اپنی سلگتی ہوئی تنہائیوں کی پناہ میں واپس آجاتے اور یوں ہی زندگی بھر کنوارے رہے۔ بقول ساحر؛ ''کچھ لڑکیاں مجھ تک دیر سے پہنچیں اور کچھ تک میں دیر سے پہنچا۔''

ساحر کی ذاتی زندگی بڑی کربناک تھی وہ اپنی نجی زندگی میں ایک دکھی انسان تھے، ماضی کی دلدوز وارداتیں انھیں ہمیشہ منتشر و مضمحل کیے رہتی تھیں۔ وہ اپنے ماضی سے بہت نالاں تھے۔ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں؛

اپنے ماضی کے تصویر سے ہراساں ہوں میں — اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے
میرا ماضی میری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں

ماضی کی کربناک یادوں کو بھلانے کے لیے انھوں نے شراب کا سہارا لیا۔ شراب اور سگریٹ نے ساحر کو کھوکھلا کر دیا اور زندگی انھیں مجسم غم واندوہ محسوس ہونے لگی؛

حیات ایک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید — خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

ساحرؔ لدھیانوی

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ رضاؔ

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں   جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اس شعر کا خالق ساحرؔ لدھیانوی آج ہمارے درمیان نہیں رہا لیکن دنیا نے جو کچھ ساحرؔ کو بخشا، وہ سب خوبصورت الفاظ کا سہارا لے کر اشعار کے روپ میں ساحرؔ دنیا کو واپس کر گیا۔

اردو شاعری نے اپنی تاریخ میں بڑے بڑے باکمال شعراء کو جنم دیا ہے جنھوں نے نہ صرف اردو ادب میں اپنا مقام بنایا بلکہ دوسری زبانوں نے بھی انھیں سراہا۔ اردو ادب میں جہاں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ جیسے نامور اور یگانۂ روزگار شاعر پیدا ہوئے ہیں وہیں جوشؔ ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ اور ساحرؔ لدھیانوی جیسے انقلابی شعراء بھی کم نہیں۔ ساحرؔ چونکہ زیادہ تر فلمی زندگی سے وابستہ رہے اس لیے نصابِ اردو میں ان کا کوئی مقام نہیں لیکن ان کے کلام کے چند مجموعے اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

ساحرؔ بطور فلمی نغمہ نگار ۱۹۴۵ء کے بعد سامنے آئے لیکن عوامی مقبولیت کے منصب پر وہ اس سے بہت پہلے فائز ہو چکے تھے۔ دَورِ طالب علمی ہی میں لاہور سے ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''تلخیاں'' شائع ہوا تو اس کی بیشتر غزلیں اور نظمیں اُس دَور کے نوجوانوں کے دل کی دھڑکن بن گئیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُس وقت ساحرؔ کی عمر صِرف اکیس سال تھی۔ ساحرؔ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ان کی نظموں کا مجموعہ ''تلخیاں'' اب تک لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے لافانی کلام کے تین مجموعے اور شایع ہو چکے ہیں جن میں ''گاتا جائے بنجارہ'' ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' اور ''پرچھائیاں'' وغیرہ ہیں۔

ساحرؔ کی شاعری میں عنفوانِ شباب کے عشقیہ جذبات کا بھی اظہار ہے۔ حسن کے قدموں پر سجدہ کرنے کی تمنا ہے، شباب کے ولولہ انگیز ترانے ہیں اور زندگی کے حسن وعشق کے نور سے جگمگا دینے کی آرزو بھی ہے۔ ان جذبات کو ساحرؔ نے اپنے انوکھے طرز اور دلکش اندازِ بیان سے اپنی نظموں اور غزلوں میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ قاری کے دل کے تاروں کو چھو لیتے ہیں۔ ساحرؔ ترقی پسند تحریک کے ایک اہم رکن تھے اور اردو شاعری کو پرانے ڈھرّے سے اٹھا کر جدید طرز پر لانے میں ساحرؔ نے بڑی جانفشانی اور محنت سے کام لیا ہے۔ اس میدان میں وہ اپنی ایک مسلمہ حیثیت منوا چکے ہیں۔

ساحرؔ ۸/ مارچ ۱۹۲۱ء کو لدھیانہ پنجاب کے ایک جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد نے عبدالحئی نام رکھا۔ ساحر نے اپنی والدہ کی سرپرستی اور نگرانی میں تعلیم حاصل کی وہ اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ والدہ کا انتقال ان کے لیے ایک ایسا سانحہ ثابت ہوا جس کے اثر سے وہ آخر دم تک بحال نہ ہو سکے۔ بی اے کے آخری سال میں وہ لدھیانہ سے لاہور منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا اور اسٹوڈینٹ فیڈریشن کے صدر ہوئے۔ اسی زمانے میں ان کا اولیں مجموعۂ کلام ''تلخیاں'' منظرِ عام پر آیا۔ اور اس طرح ایک اُبھرتے ہوئے شاعر کی حیثیت سے وہ ادبی دنیا میں روشناس ہوئے۔

ادبی ذوق ساحرؔ کے اندر بچپن سے تھا۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے دہلی سے ماہنامہ ''شاہراہ'' کا اجراء کیا۔ اس کے ساتھ ہی رسالہ ''پریت کی لڑی'' کی ادارت بھی کی۔ اس کے علاوہ ساحر ''شہکار'' اور ''سویرا'' کے مدیر بھی رہے۔ فلمی زندگی سے وابستہ ہونے کے بعد ساحر کی مصروفیت میں اضافہ ہو گیا لیکن انھوں نے فلمی گیتوں اور غزلوں میں اپنے سیاسی اور سماجی تصور کو ظاہر کرنے کی گنجائش نکالی اور اس طرح انھوں نے فلمی گیتوں کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنا لیا۔ ساحر نے اپنی شاعری کو مشغلے کے طور پر کبھی استعمال نہیں کیا جیسا کہ فلمی دنیا کا دستور ہے۔ ساحر کے نغمے فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جانے لگے تھے اور ساحر نے بھی ہمیشہ یہی کوشش

زندہ رہ سکیں تا کہ وہ ان کا استحصال کرتے رہیں۔ چنانچہ سخت سے سخت محنت لینے کا اور کم سے کم مزدوری دینے کا عام رواج بن گیا تھا اور گھیسو اسے سراسر ظلم سمجھتا تھا۔ بہر حال وہ اسی استحصالی سماج کے شکار تھے اور بدھیا کے چلانے اور کراہنے کے باوجود دونوں چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ کچھ پیسے کی ضرورت تھی اور پیسہ ان کے پاس تھا ہی نہیں چنانچہ پریم چند ان کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت، ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، کہیں زیادہ فارغ البال تھے۔ وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی، گھیسو کسانوں کے مقابلے زیادہ باریک بیں تھا۔''

دراصل گھیسو اس سماجی حقیقت سے واقف تھا اور اس کا مخالف تھا۔ وہ اس زمیندار اور عوام دونوں کی بے توجہی سے بھی دوچار رہتا تھا۔ وہ اس سماجی نظام سے مایوس تھا۔ وہ کام نہ کرنے کی وجہ سے مفلوک الحالی کا شکار تھا مگر زمیندار بھی کام نہیں کرتے تھے اور عیش و عشرت کی زندگی بھی گزارتے تھے۔ گھیسو سادہ لوح تھا لیکن زمیندار شاطر اور چالباز تھے۔ گھیسو زمینداروں کی شاطرانہ چالوں سے واقف تھا اس لیے دل سے اس کا مخالف بھی تھا چنانچہ وہ اس کہانی میں زمینداروں کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہتا ہے؛

''وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھوں لوٹتے اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں نہانے جاتے ہیں۔''

گھیسو اور مادھو اپنے استحصالی نظام کے انتہائی محروم اور مایوس کردار ہیں۔ اس لیے جب بدھیا کی مدد کی ضرورت تھی تو اپنی ہمدردی کے احساس کے باوجود اپنی تمام توجہ کو دوسری جانب موڑ دیتے ہیں کیونکہ انتہائی مجبوری اور لاچاری کی حالت میں جب آدمی کچھ نہیں کر پاتا تو نفسیاتی اور فطری طور پر اپنی محرومی اور کچھ نہ کر پانے کی حالت میں خود بخود ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ اپنی حالت کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ''سوچتا ہوں کہ کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں''۔ ایسی مایوس کن اور بے بسی کی حالت میں وہ دونوں حقیقی دنیا کے بجائے خیالی اور تصوراتی دنیا میں چلے جاتے ہیں اور اپنی حقیقی کمیوں، مایوسیوں اور لاچاریوں کا ازالہ تصوراتی طور پر کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ

ایسی صورت میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں جس میں سے ایک اہم پہلو ان کی آزادی اور کسی کا غلام نہ بننے کا عمل ہے۔ چنانچہ وہ مختلف پریشانیوں سے دوچار رہتے ہیں اور جب کفن خریدنے کے نام پر انھیں پانچ روپئے ملتے ہیں تو دونوں کفن خریدنے کے لیے بازار جاتے ہیں اور کفن خریدنے کے بجائے شراب خانے چلے جاتے ہیں۔ اپنی ناکام حسرتوں کی تکمیل کے لیے پوریاں کھاتے ہیں اور شراب پی کر بدمست ہو جاتے ہیں تو گھیسو بڑی پُر اعتمادی سے کہتا ہے؛

''وہی لوگ دینگے، جنھوں نے اب دیا ہے۔ ہاں وہ روپیہ ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اگر اسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اس طرح یہاں بیٹھیں گے اور ''کفن''، تیسری بار ملے گا۔''

اسی طرح مادھو جب اپنی بیوی کی پریشانیوں اور دکھوں کو یاد کر کے رونے لگتا ہے تو گھیسو اپنے اخلاقی جُرم اور احساسِ ندامت کو مایا جال سے نجات کی طرف منتقل کرتے ہوئے اسی پُر اعتمادی سے پھر مادھو کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے؛

''کیوں روتا ہے بیٹا، خُش ہو کہ وہ مایا جال سے مُکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیے۔''

ایک محروم، بے بس اور لاچار آدمی میں کیسی شدید خواہش ہوتی ہے جس کو کہانی کار نے بڑے فطری انداز میں الاؤ کے پاس بھُنے آلو کی تصویر کشی کر کے دکھانے کی کوشش کی ہے اور اپنی بے بسی کے باعث توجہ دوسری جانب موڑ کر ٹھاکر کی بارات کے کھانے کو یاد کر کے کرتا ہے۔ پھر شراب خانے میں پوریاں کھاتے ہوئے کرتا ہے۔ یہ افسانہ ''کفن'' آزادی سے قبل انگریزی دورِ حکومت کے زمیندارانہ استحصالی نظام و معاشرت کی سچی ترجمانی ہے۔ جس میں اس نظام کے ہاتھوں مجبور لوگ اپنے آپ کو کس طرح مجبوراً حالات کے حوالے کر دیتے ہیں۔ گھیسو اور مادھو نے اس کہانی میں وہی کر دِکھایا ہے جو ان حالات میں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ وہ دونوں دراصل اسی نظام کے پیداوار ہیں اور حالات نے انھیں ایسا بنا دیا ہے۔ کہانی جو غیر متوقع موڑ لیتی ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور تعجب خیز بھی جو اس کہانی میں جان ڈال دیتی ہے۔ یہ کہانی اپنے اجزائے ترکیبی، مواد و موضوع، زبان و بیان، مکالمہ اور تکنیک ہر لحاظ سے ایک کامیاب ترین افسانہ ہے اور اگر اسے پریم چند کا شاہکار افسانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

○■○

ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن، یو۔ پی۔ ۲۷۵۱۰۱

پریم چند کے افسانہ ''کفن'' کا تجزیاتی مطالعہ

عدیلہ نسیم (ریسرچ اسکالر) بی ایچ یو

پریم چند اردو کے قد آور افسانہ نگار ہیں۔ اردو میں باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز دراصل پریم چند نے ہی کیا ہے۔ انھوں نے اردو افسانہ نگاری کو رومانی خیالات کی غیر حقیقی اور خیالی دنیا جس میں ادب کو عموماً تفریح کا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا سے نکال کر حقیقت پسندی سے روشناس کرایا اور سماج کے گرے پڑے لوگوں کی حقیقی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ کسانوں مزدوروں، محنت کشوں دستکاروں، کمزوروں اور لاچاروں کی حمایت کی اور ان کی حالتِ زار کی سچی تصویریں دِکھائیں نیز سماجی ناہمواریوں، استحصالی نظام کی حقیقت سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں صداقت، حقیقت، مشاہدے اور تجربے کو جگہ دے کر مایوس ومحروم اور مردہ پرست معاشرے کو نیا حوصلہ دیا۔

پریم چند اردو کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو ترقی پسند تحریک کے آغاز سے بہت پہلے ہندوستانی دیہاتوں اور وہاں کے لوگوں میں زندگیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر ادب برائے زندگی اور ادب کو انسانی سماج کا ترجمان بنانے کی عملی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء منعقدہ لکھنؤ کی انھوں نے صدارت کی تھی اور اپنے صدارتی خطبہ میں نئے ملکی اور عالمی حالات کے پیشِ نظر ادب کی تخلیق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا؛

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں آزادی کا جذبہ ہو، تعمیر کی روح ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور روشنی پیدا کرے''

پریم چند کے افسانے ان کی مذکورہ کسوٹی پر ہمیشہ پورے اترتے ہیں۔ انھوں نے سیکڑوں افسانے لکھے اور ان کے بیشتر افسانے زندگی کی حقیقت پسندی اور معاشرتی سچائیوں کے ہی عکاس ہیں چنانچہ ان کا ایک بہت ہی اہم کامیاب اور مشہور افسانہ ''کفن'' بھی ہے۔ اس افسانے کے تین اہم کردار بھی ہیں گھیسو، مادھو اور بدھیا اور پوری کہانی کا بنیادی موضوع بدھیا کی پیدائش کی حالت میں موت ہے۔ پریم چند نے آزادی سے پہلے گاؤں میں دِلت لوگوں کی حالتِ زار کا اس کہانی میں سچا آئینہ دِکھایا ہے۔ 'کفن' غالباً پریم چند کا آخری افسانہ بھی ہے۔ گھیسو اور مادھو جو ذات کے چمار ہیں۔ گھیسو باپ ہے، مادھو بیٹا اور بدھیا مادھو کی بیوی یعنی کہ گھیسو کی پتوہ۔ یہ دونوں باپ بیٹا اپنا پیشہ نہ کر کے مزدوری کرتے ہیں اور بھوکی ننگی زندگی گزارتے ہیں۔ گھیسو کے بیٹے مادھو کی بیوی امید سے ہے اور پیدائش کے کرب سے دوچار ہے، دردِ زہ سے چلاّ رہی ہے، پچھاڑے کھا رہی ہے اور دونوں ہمدردی کے احساس کے باوجود آلو کھانے میں مصروف ہیں کیوں کہ وہ اپنے مجبوری کے باعث اس کی کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ بدھیا بالآخر طبی مدد نہ ملنے کے باعث مر جاتی ہے۔ اس کے مر جانے پر دونوں باپ بیٹے گاؤں کے زمیندار کے پاس جاتے ہیں اور کفن کے لیے روپئے مانگتے ہیں۔ زمیندار اور دوسرے لوگ ملا کر انھیں پانچ روپئے دیتے ہیں۔ دونوں کفن خریدنے کے لیے بازار جاتے ہیں اور کفن خریدنے کے بجائے شراب خانے جا کر پوری کچوری کھاتے ہیں اور شراب پی کر وہیں گر پڑتے ہیں۔

اس افسانہ ''کفن'' میں پریم چند کی کردار نگاری اپنے عروج پر ہے چنانچہ گھیسو اور مادھو کی شخصیت اس کہانی میں کافی تہہ دار نظر آتی ہے۔ دونوں غربت اور مفلوک الحالی کے شکار ہیں۔ مایوسی اور محرومی ان کا مقدر بن گئی ہے۔ ان کے پاس زمین نہ ہونے کی وجہ سے دونوں محنت مزدوری کرتے ہیں مگر انھیں پیٹ بھر کھانا ملتا ہے نہ تن ڈھانکتے کے لیے کپڑا اور نہ ہی سر چھپانے کے لیے چھت۔ چنانچہ دونوں سماجی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور حالات نے انھیں نکما اور کام چور بنا دیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے دَور کے استحصالی نظام کے شدید مخالف بن گئے ہیں اسی لیے وہ بڑی حد تک اکیلے پن کا بھی شکار ہو گئے ہیں۔

ہندوستان کا زمیندارانہ نظام جو دراصل انگریزوں کا قائم کردہ استحصالی نظام تھا اور اس نظام میں انگریزی حکومت کے زمیندار اور سرکاری اہل کار سب سے بڑے ایجنٹ تھے اور ساہوکار، مہاجن اور سیاسی اور مذہبی رہنما اِن ایجنٹوں کے معاون وہم نوا تھے اور سب مل کر دونوں ہاتھوں سے غریب عوام کو لوٹتے تھے اور اس لُوٹی ہوئی رقم سے اپنے انگریز آقاؤں کو خوش کرتے تھے اور خود بھی عیش وعشرت کی زندگی گزارتے تھے۔ زمیندار عموماً اونچی ذات کے ہوتے تھے جو عام لوگوں سے جی توڑ محنت کرا کے بھی صرف اتنی اجرت دیتے تھے کہ وہ کسی طرح

شخصیت کو ایک بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی۔ وہ ہندو پاک دوستی کے زبردست حامی تھے۔ ان کی مقبول نظم ''دوستی کا ہاتھ'' ان کے انہی جذبات کی عکاس ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

گزر گئے کئی موسم کئی رُتیں بدلیں
اداس تم بھی ہو یار و اداس ہم بھی ہیں
فقط تم ہی کو نہیں رنج چاکِ دامانی
جو سچ کہیں تو دریدہ لباس ہم بھی ہیں

تمہارے دیس میں آیا ہوں دوستو اب کے
نہ ساز و نغمہ کی محفل نہ شاعری کے لیے
اگر تمہاری انا ہی کا ہے سوال تو پھر
چلو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں دوستی کے لیے

وہ امن کے پیغامبر تھے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ ان جذبات کو فروغ دینے میں مسلسل کوشاں رہے۔ ہندوستان میں فیض کے بعد پاکستان کے سب سے ہر دلعزیز شاعر احمد فرازؔ تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے ہندو پاک کے عوام کو بے حد متاثر کیا۔ ان کی نظموں میں 'قلم سرخ ہے'، 'نئی مسافت کا عہد نامہ' ، 'اب کس کا جشن مناتے ہو'، 'دوستی کا ہاتھ' اور محاصرہ بے حد مقبول ہوئیں۔ انھوں نے ضمیر کی آواز کو کس فنکاری سے پیش کیا ہے اس کی بہترین مثال ان کی نظم ''محاصرہ'' ہے۔ اس کا آخری حصہ ملاحظہ فرمائیں؛

میرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
میرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اس لیے جو لکھا تپاک جاں سے لکھا
جبیں پہ لوچ کماں کا، زباں تیر کی ہے

میں کٹگھروں کی سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا رسانیوں کی قسم
میرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

''سنا ہے لوگ'' بھی ان کی ایک مقبول غزل کہی جاسکتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں؛

سُنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سُنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے آئینہ تمثال ہے جبیں اس کی
جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کر دیکھتے ہیں
رُکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کر دیکھتے ہیں

فراز کا کہنا تھا کہ شاعر و ادیب صرف لفظوں کے بازیگر نہیں ہوتے بلکہ ان کی کچھ سماجی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں اور وہ بے حس، بے خبر اور بے ضمیر شخص کی طرح گرد و پیش کے حالات سے بے نیاز ہو کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ احمد فرازؔ ساری زندگی قلم اور ضمیر کی آزادی کے لیے لڑتے ہوئے ۲۵ راگست ۲۰۰۸ء کو ۷۶ سال کی عمر میں ہم سے جدا ہو گئے لیکن وہ اپنی شاعری کے لیے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ان کو ان کی ادبی خدمات کے لیے مختلف قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔

ابراہیم منزل، مسدی محلّہ، ریل پار، آسنسول، ویسٹ بنگال ۷۱۳۳۰۲

رومان پسند انقلابی شاعر

احمد فرازؔ

ڈاکٹر انور ادیب

احمد فرازؔ عہدِ حاضر کے انتہائی مقبول اور رومان پسند انقلابی شاعر تھے۔فیض احمد فیضؔ کے بعد انھیں برّ صغیر کا عظیم ترین شاعر سمجھا جاتا تھا۔وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی ملکوں کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول تھے۔وہ ایک جمہوریت پسند شاعر تھے۔اپنی جمہوریت پسندی کی وجہ سے وہ ہمیشہ حکمرانوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنتے رہے۔جنرل ضیاءالحق کے دَورِاقتدار میں ڈکٹیٹر شپ کی مخالفت کرنے پر 1977 میں انھیں جیل جانا پڑا۔

احمد فرازؔ جن کا اصلی نام سید احمد شاہ علی تھا 12 جنوری 1931ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔انھوں نے پشاور کے اسلامیہ کالج (ایڈورڈ کالج) سے گریجویشن کے بعد اردو اور فارسی میں ایم۔اے۔کیا اور مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی گئے وہاں انھوں نے ایک جرمن خاتون سے شادی کی مگر یہ شادی کامیاب نہیں رہی۔دوسری شادی انھوں نے حکومتِ پاکستان کی ایک اعلیٰ سرکاری افسر ریحانہ گل سے کی،جن سے ایک بیٹا شبلی فراز ہیں جو پاکستانی فوج میں کرنل کے عہدے پر فائز ہیں۔

فرازؔ کے کیریئر کا آغاز ریڈیو پاکستان پشاور میں بطورِ اسکرپٹ رائٹر ہوا۔بعدازاں وہ پشاور یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے تھے۔1976ء میں وہ اکیڈمی ادبیات کے بانی ڈائرکٹر کے عہدہ پر فائز رہے۔بعد میں نیشنل بُک فاؤنڈیشن کی نگرانی بھی ان کو سونپی گئی۔احمد فرازؔ کو کم عمری ہی سے شعروشاعری سے دلچسپی تھی اور انھوں نے اشعار بھی کہنے شروع کر دیے تھے۔گریجویشن کے دوران ہی ان کا پہلا شعری مجموعہ ''تنہا تنہا'' شائع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔یہ ان کی خداداد صلاحیت کا نتیجہ تھا۔ان کے تیرہ مجموعے منظرِ عام پر آئے جن میں دردآشوب،شب خون،میرے خواب ریزہ ریزہ،خواب گل پریشاں،غزل بہانہ کرو،جانِ جاناں،عشقِ جنوں پیشہ،بے آواز گلی کوچوں میں وغیرہ متعدد بار شائع ہوئے اور بے حد مقبول ہوئے۔ان کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔

ان کی شخصیت اور فن پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔طلبا ان کی شاعری کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی۔کر رہے ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی میں ان کا کلام داخلِ نصاب ہے۔اس سے ان کی مقبولیت اور قدرومنزلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ابتدا میں وہ فیض احمد فیضؔ کے انداز سے متاثر نظر آتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کے انداز اور اسلوب میں انفرادیت پیدا ہوتی گئی۔انھوں نے ظلم وجبر اور آمریت کے خلاف آواز اٹھائی جس کے لیے انھیں قیدوبند سے بھی گزرنا پڑا۔جنرل ضیاءالحق کے دورِاقتدار میں انھیں جلاوطنی کی زندگی گزارنی پڑی۔انھوں نے آمریت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جنرل پرویز مشرف کے دور میں حکومتِ پاکستان کا ایوارڈ ''ہلالِ امتیاز'' واپس کر دیا۔جو ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 2004ء میں عطا کیا گیا تھا۔

ان کی شاعری میں انقلاب کی تڑپ اور عشق کی کسک کا بخوبی ادراک کیا جا سکتا ہے۔ان کے اندر ایک بے مثال جرأت تھی۔ان کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ان کی شاعری ان کی بے لوث شخصیت اور احساس فکر سے مملو تھی۔انھوں نے انسانی حقوق کے لیے جو کام کیے اس سے ان کی

مختصر تعارف

نئی دہلی میونسپل کونسل کے حالیہ صدر عالیجناب جلج شریواستو (آئی اے ایس) راجدھانی کے مخصوص علاقے کو بجلی، پانی، تعلیم، سڑک، صحت، صفائی، عالمی اخوت وہمدردی اور مثبت ماحول پیدا کرنے والی این ڈی ایم سی کے عظیم انتظامیہ صدر کے عہدے کو دَورِ حاضر میں بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔

ہندوستانی تہذیب سے مالا مال خاندان میں ۸/فروری ۱۹۶۱ء کو جناب جلج شریواستو کا جنم ہوا۔ ۱۹۸۱ء میں تقریباً ۲۰/سال کی عمر میں انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفنس کالج سے فزکس میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ انھوں نے ایم بی اے کی ڈگری بھی آئی آئی ایم ٹی سے ۸-۲۰۰۵ء میں اپنے فرائض کو انجام دیتے ہوئے حاصل کیا۔

پہلی بار ۱۹۸۳ء کے بیچ (Batch) میں آئی پی ایس کے امتحان میں کامیاب ہوکر ٹریننگ حاصل کی۔ اگلے سال انھوں نے آئی اے ایس کا امتحان پاس کیا۔ کثیرالجہات مہارتوں کے مالک جناب شریواستو دہلی یونیورسٹی کے اپنے کالج میں ہی فزکس کے لکچرار بھی رہے۔ شریواستو ۱۹۸۵ء میں آسام میں ٹریننگ کے دوران تاریخی ''آسام اکورڈ'' (Assam Accord) سے جڑے رہے۔

بعد ازیں، شریواستو ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۱ء تک ارونا چل پردیش میں ڈپٹی کمشنر رہے۔ ۱۹۹۴ء میں وزارتِ داخلہ میں ڈائریکٹر، ۲۰۰۷ء میں انڈین فوڈ کارپوریشن میں کارگزار ڈائریکٹر اور ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۷ء تک حکومتِ دہلی کے ڈی ایس آئی ڈی سی میں مینیجنگ ڈائریکٹر جیسے انتہائی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ جناب جلج شریواستو قومی زبان ''ہندی'' کے ایک مقابلہ جاتی پروگرام میں شرکا کو انعامات سے نوازنے کے دوران انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ: ''ہمیں ہندی کا صرف احترام ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے سرکاری کام کاج میں قومی زبان ''ہندی'' کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیے، یہی ہندی کا مناسب احترام کہلائے گا۔''

دنیا کا مشہور شہر دہلی میں رہنے والے سیاستدانوں، مخصوص شخصیات اور تمام شہریوں کو اعلیٰ درجے کی شہری سہولیات، دِلوں کو موہ لینے والے پارک اور خوبصورت سڑکیں و دیگر سہولیات میں زیادہ سے زیادہ بہتری لانے کے لیے جناب جلج شریواستو پُرعزم ہیں۔

نئی دہلی میونسپل کونسل اور حلقے کے باشندوں کو آپ سے بہت امیدیں ہیں۔ ہنس مُکھ، شیریں زباں اور ظریفانہ طبیعت کے مالک جناب شریواستو ایمانداری سے اپنے کام کو انجام دینے میں یقین رکھتے ہیں۔

نئی دلّی میونسپل کونسل

پالیکا سماچار

نئی دہلی پالیکا سماچار

☆ جلد......۳۷ ☆ شمارہ......۱-۲ ☆ دوماہی ☆ جنوری-فروری ۲۰۱۴ء

اس شمارہ میں

☆اداریہ☆

اداریہ:			
تعارف:			۲
شخصیات وادبیات:	''جلج شریواستو''	شعبۂ ہندی	۳
	رومان پسند انقلابی شاعر: احمد فرآز	ڈاکٹرانورادیب	۴
	پریم چند کے افسانہ ''کفن'' کا تجزیاتی مطالعہ	عدیلہ نسیم، ریسرچ اسکالر(پی ایچ یو)	۶
	ساحرلدھیانوی	ڈاکٹرایس ایم رضا	۸
	شبلی نعمانی: مختصر جائزہ	ابوہریرہ خاں، ریسرچ اسکالر	۱۵
انشائیہ	عہدِپیری ''خضاب'' کی باتیں	مختارٹونکی	۱۱
کہانی:	تین کہانیاں	ایس شاہدحسن جیک	۱۴
افسانہ:	''ماتم کی خوشی''	محمدطارق	۲۲
خبرنامہ:		ادارہ	۱۹

❖غزلیات❖

اخترکلیم غازیپوری..۱۷

منظورالحق ناظر..۱۷

مومن خاں شوق..۱۸

سلیم خان..(نظم، ''بھوک'')..۱۹

ڈاکٹرشباب لِلت..۱۹

شاہداختر..۲۰

شکیل سہسرامی..۲۰

ڈاکٹریوسف صابر..(نظم، ''بیٹی'')..۲۱

''تحریروں میں اظہارِ خیال مصنفین کے اپنے ہیں۔ اِس سے ادارتی بورڈ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ مدیر کو اِن تحریروں میں اصلاح اور قطع وبرید کا پورا حق ہے۔ اِن خیالات پر کسی طرح کے اعتراضات کا حق مصنفوں کا ہی ہے اور کسی بھی تنازعہ کا قانونی چارہ جوئی دلّی کی عدالت میں ہوگی۔'' (مدیر)

نئی دلّی میونسپل کونسل

پالیکا سماچار

☆ادارتی بورڈ☆

جلد ۳۷۔دوماہی۔شمارہ ۱-۲ جنوری رفروری ۲۰۱۴ء

سرپرست

جلج شریواستو

☆☆

چیف ایڈیٹر

وکاس آنند

☆☆

ڈپٹی چیف ایڈیٹر

اے کے مشرا

☆☆

انیتا جوشی

ایڈیٹر و ناشر

☆☆

تعاون

انیس فاطمہ

سنیتا بوہادیہ

آصف علی

☆☆☆

فی شمارہ -/20 روپیہ

سالانہ -/100 روپیہ

پانچ سال کے لیے -/400 روپیہ

ترسیل زر کا پتہ: سکریٹری نئی دلی میونسپل کونسل پالیکا کیندر

پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی۔۱۱۰۰۰۱

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر پالیکا سماچار اردو شعبۂ اردو کمرہ ۱۲۰۹

پالیکا کیندر پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی۔۱۱۰۰۰۱

فون نمبر: 41501354 to 70/3209

اداریہ

(مدیر کے قلم سے)   جنوری۔فروری ۲۰۱۴ء

سب سے پہلے میں آپ کا نئے سال ۲۰۱۴ء میں استقبال کرتے ہوئے آپ کو اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نئے سال کی آمد کے ساتھ ہی موسمِ سرما سالِ نو کی خوشیوں کی گرماہٹ سے بھر جاتا ہے۔ سالِ نو جہاں ہمیں اپنا احتساب کرنے کے لیے تحریک دیتا ہے وہیں ہمیں یہ بھی سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ گزرے سال میں ہم اپنے خاندان، معاشرہ اور ملک کے تئیں فرائض کو نبھانے میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔ نئے سال میں ہمیں مقررہ اہداف کو حاصل کرنے میں عزمِ مصمم اور استقلال کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ اسی اعتماد و یقین کے سہارے ہی تمام ہندوستانیوں کو ترقی کی راہ ملے گی۔

پوری دنیا میں جمہوری نظام ہی سب سے بہتر نظام ہے کیوں کہ اس میں ملک کے عوام کی حصہ داری ہوتی ہے۔ ہمیں آزادی کے ان شہیدوں کی قربانیوں کو نہیں بھولنا چاہیے جن کے سبب آج ہمارا ملک آزاد ہے۔ ہمیں عہد کرنا چاہیے کہ ہم ملک کی حفاظت، اس کی عظمت اور ترقی کے لیے ہمیشہ تیار رہیں گے۔ تمام شہریوں کا فرض ہے کہ پوری ایمانداری، کڑی محنت اور آپسی تال میل کے ساتھ ملک کی ترقی اور خوشحالی میں اپنا بھرپور تعاون دیں۔ یومِ جمہوریہ ملک کو ایک دھاگے میں پرونے کے ساتھ ساتھ شہریوں میں قومی بیداری کو فروغ دیتا ہے۔

قدرت اپنا رنگ و روپ تبدیلیِ موسم کے ذریعہ وقت وقت پر بدلتی رہتی ہے۔ موسمِ بہار اِن موسموں میں سے ایک ہے جو سردی کے بعد ماحول میں خوبصورتی اور دلکشی کو فروغ دیتا ہے۔ آج انسان فطرت کے تئیں اپنے فرائض کو بھول گیا ہے جس کے نتیجے میں انسانوں کو اکثر قدرتی آفات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ انسانی زندگی کو خوشحال بنانے کے لیے فطرت سے مسلسل ہم آہنگی آج کی اہم ضرورت ہے تاکہ آنے والی نسلِ انسانی کو اِس کے بُرے نتائج سے بچایا جا سکے۔

وکاس آنند
چیف ایڈیٹر

"پالیکا سماچار اردو نئی دہلی"، میونسپل کونسل کے لیے انیتا جوشی نے شائع کیا اور نوتن پرنٹرس

F/89/12 اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیس 1، نئی دہلی 110020 ، Tel.: 26817055